مولانا حافظ انوار الحق صاحب ایم اے استاذِ حدیث و نائب مہتمم دار العلوم حقانیہ

میرے والد میرے شیخ

ایک عظیم مربی، خاندان کے سربراہ اور ایک مہربان راہنما کی حیثیت سے

خاندان کے سربراہ چودھویں صدی ہجری کے محدثِ کبیر، والدی و اُستاذی و مُرشدی حضرت مولانا عبد الحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ نہ صرف گھر سے باہر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اپنے علمی کمالات سے دُنیائے اسلام کو منوّر کیا، بلکہ اپنی گھریلو زندگی میں گھر کی چار دیواری کے اندر بھی انہوں نے بطور والد و مربی اور خاندان کے ایک سربراہ کے تمام گھریلو امور میں شریعت کو اوّلین حیثیت دی۔ غمی ہو یا شادی دونوں میں اہلِ خانہ کو شریعت کے مطابق ان سے برد آزما ہونے کی تلقین کرتے رہتے۔ گھریلو امور میں نہ کبھی بلا ضرورت سختی کی اور نہ کبھی دینی معاملات میں مداہنت روا رکھی ــــ گھر میں داخل ہوتے ہی اگر کھانے کا وقت ہوتا اور جو کچھ تیار ہوتا آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا، کبھی یہ تک نہ فرمایا کہ یہ سالن یا روٹی مزاج کے موافق نہیں اور نہ کبھی طعام کے معاملہ میں بے جا تکلفات پر گھر والوں کو مجبور کیا۔ آتے ہی گھر کے تمام بچوں کو بلا کر ان سے محبت و شفقت کا اظہار کر کے حضور سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا کا عملی مظاہرہ فرماتے۔

انہماکِ مطالعہ جن دنوں صحت کچھ اچھی رہی گھر میں زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کرتے۔ جبکہ حالت یہ تھی کہ چھوٹے سے گھر میں مختصر سا کمرہ بالائی منزل میں ان کے لیے مخصوص تھا اور اس کمرہ اور اس کے اردگرد ہم بھائیوں، بہنوں کے ہجوم اور ان کے شور و غوغا کی وجہ سے کسی معمولی سے طالب علم تک کے لیے بھی مطالعہ ناممکن ہوتا، لیکن انہوں نے کبھی بھی کسی قسم کی تنگی کا اظہار نہ فرمایا۔

بے مثال صبر و تحمل بیماری کے دوران جب سخت تکلیف شروع ہو جاتی تو جب تک برداشت کرنے کی سکت ہوتی گھر کے کسی فرد کے سامنے اس کا اظہار نہ فرماتے کہ کہیں کسی فرد کے سامنے اظہار سے نوبت ڈاکٹر اور پھر ہسپتال تک پہنچ کر حدیث کے پڑھانے میں تعطل کا باعث نہ بنے۔

نماز باجماعت کا اہتمام غالباً ۱۹۷۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کو سخت گرمی میں نمازِ ظہر کے لیے مسجد تشریف لے جا رہے تھے، گھر سے ملحق بیٹھک کے سامنے راستے میں میرا سامنا ہوا، فرمایا کہ کھڑے کھڑے میرے بازو کو ذرا دبا دو، میں نے دبانا شروع کیا اور پوچھا کہ کیا تکلیف ہے؟ فرمایا کہ کل سے مسلسل دل اور بازو میں شدید درد ہے۔ میں نے اصرار کیا کہ گھر واپس تشریف لے جا کر گھر ہی میں نماز پڑھ لیں۔ انکار فرما دیا اور مسجد میں تشریف لے جا کر جماعت سے نماز ادا فرمائی۔ اُسی دن عصر کو جب قوتِ برداشت جواب دے گئی تو شام کو سی ایم ایچ نوشہرہ معائنہ کے لیے لے جائے گئے۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر محترم جناب انور صاحب نے معائنہ کر کے کہا کہ "یہ تو انتہائی شدید دل کا دورہ ہے کہ کل ہی آپ کو ہسپتال پہنچنا چاہیئے تھا، مگر مولانا کے پاس نہ جانے کون سی انجانی قوتِ برداشت ہے کہ اتنی شدید تکلیف کے باوجود دو دن سے احادیث بھی پڑھاتے رہے اور اپنے گھریلو اور دار العلوم کے انتظامی فرائض بھی سرانجام دیتے رہے"۔

اس دورۂ دل کی شدت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس تکلیف سے افاقہ کے لیے پورے دو ماہ نوشہرہ سی ایم ایچ ہسپتال میں گذارنے پڑے۔

متاعِ عزیز گھر کے اندر آپ کا محبوب ترین خزانہ و متاع مختلف علوم و فنون کی کتب کا وہ مجموعہ جو کہ زیادہ تر تفسیر و حدیث پر مشتمل تھا، کو ہر چیز سے عزیز سمجھتے تھے۔ آپ کی چارپائی کے اردگرد الماریوں اور میز پر ہر وقت کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ اس کا اتنا اہتمام فرماتے کہ گھر آتے ہی پہلے اس پر نظر فرماتے کہ کہیں کسی بچے نے ان کتب میں اُلٹ پھیر کر کے کسی کتاب یا اس کے ورق کو ضائع تو نہیں کر دیا۔ اگر کسی بات پر ان کو کبھی رنج ہوا بھی تو اس بات پر کہ ان کے ذخیرۂ کتب کو چھیڑا گیا ہے۔

> **نہ کبھی گھریلو امور میں بلا ضرورت سختی کی اور نہ کبھی دینی معاملات میں مداہنت روا رکھی**

والدین کی اطاعت ارشادِ ربانی: وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ کے اتنے پابند تھے کہ ان کے والد مرحوم

یعنی ہمارے دادا جان نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت تو ہمارے بچپن ہی میں ہوئی تو اُن کے ساتھ سلوک اور عام واقعات کا تو مشاہدہ نہیں ہوا البتہ بعد میں اُس دور کے بزرگوں کی زبانی سُنا کہ اپنے والد محترم کے بیحد تابع، مطیع اور فرمانبردار رہے، کبھی اُن سے اُونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔ اور ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کہ "بیٹا ایک نامور عالم دین بن جائے،" دنیاوی امور سے سلسلہ منقطع کر کے اپنے آپ کو ہمہ وقت وہمہ تن وقف کر دیا اور اپنے والد مکرم کے لیے بمصداق حدیث خیر الایام صدقہ جاریہ بن کر رہتی دُنیا تک ان کے نامۂ اعمال میں بھی اشاعتِ دین کے عظیم فریضہ کا اجر و ثواب محسوب فرمانے لگے۔

اکرامِ والدہ

والدہ محترمہ یعنی ہماری دادی صاحبہ نور اللہ مضجعہا کی وفات تو دادا صاحب مرحوم ومغفور کے انتقال کے کافی عرصہ بعد ہوئی۔ ہم لوگ بھی عمر کی اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے اپنی والدہ صاحبہ سے تعلق اور سلوک کے کافی واقعات اب بھی ذہن کے دریچوں میں محفوظ ہیں۔ صبح گھر سے نکلتے وقت اور باہر کی مصروفیات سے فراغت کے بعد گھر آتے ہی پہلا کام یہ ہوتا کہ والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضری دے کر ان کا حال و احوال پوچھتے، حتیٰ کہ اگر گھر سے دار العلوم یا مسجد تک بھی جاتے تو انکے پاس آکر ان سے اجازت لینے کے بعد گھر سے باہر تشریف لے جاتے۔ اور اگر کبھی سفر پر جانا ہوتا تو پھر اس اجازت لینے کا اہتمام والتزام اور بھی زیادہ فرماتے جبکہ اس وقت والدہ ماجدہ کی حالت عمر کے لحاظ سے ایسی تھی کہ آنکھوں کی بینائی ختم اور قوتِ سماع میں کمی کے ساتھ ساتھ چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا تھا، اکثر و بیشتر ان کی دلجوئی کے لیے گھر سے نکلتے وقت جیب سے کچھ رقم نکال کر ان کی خدمت میں پیش فرماتے جبکہ وہ بار بار اصرار کرتیں کہ اس عمر اور اس حالت میں مجھے پیسوں کی کیا ضرورت ہے جبکہ میری تمام ضروریات آپ پوری کر دیتے ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا عبد الحقؒ شدید دورۂ قلب کے باوجود حدیثِ رسولؐ پڑھاتے رہے

والدہ سے اجازت کا اہتمام

ایک دفعہ کہیں باہر سفر پر تشریف لے جا رہے تھے، دو تین خدام ساتھ تھے، بس کے اڈہ تک پہنچ گئے، وہاں ساتھیوں سے فرمایا کہ آپ یہاں رُک جائیں میں واپس گھر جا رہا ہوں ایک ضروری بات بھول گیا ہوں، چنانچہ آپ گھر آئے اور پھر فوراً واپس تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گھر واپس آنا صرف اس لیے تھا کہ اس بار گھر سے نکلتے وقت اتنی جلدی میں تھے کہ والدہ محترمہ سے اجازت نہ لی جا سکی۔ اڈہ پر پہنچ کر جب یاد آیا تو واپس آکر والدہ کی خدمت میں عرض کیا کہ "امی جان! سفر پر جا رہا ہوں دُعا میں یاد فرماتے رہنا"۔ پھر والدہ بھی ایسی تھیں کہ گھر سے ان کے نکلنے پر دعوات کے لیے جھولی پھیلاتیں تو پھر یہ سلسلہ اُن کی واپسی تک جاری رہتا ــــ اور بِرًّا بِوَالِدَیْہِ کا یہ سلسلہ صرف گھر تک ہی محدود نہ رہا بلکہ خطبۂ جمعہ ہو یا رمضان شریف میں ختم قرآن کا موقع ہو یا خطبۂ عیدین کے اجتماع پر اپنے خطاب میں کسی نہ کسی انداز میں والدین کے ساتھ احسان و حُسنِ سلوک پر زور دیتے رہتے۔

احترامِ انسانیت اور اکرامِ ضیف

حضرت شیخ الحدیثؒ احترامِ انسانیت میں اپنی مثال آپ تھے۔ بلا لحاظ مرتبہ جو بھی ملنے کے لیے گھر کے دروازہ پر آتا اطلاع ملنے پر گھر کی بالائی منزل سے فوراً اس سے ملنے کے لیے دروازہ پر آجاتے، اور مہمان کی تواضع کے لیے وقت کی مناسبت سے گھر میں تاکید فرمادیتے اور مہمان نوازی کی یہ حالت تھی کہ مہمان کے آنے پر گھر میں جو کچھ موجود ہوتا اُس کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم فرماتے، صرف یہی نہیں بلکہ مسجد میں مقیم طلباء اور مسافروں کے طعام و قیام کے لیے بھی جب تک گھر سے بندوبست نہ فرما لیتے چین سے نہ بیٹھتے ــــ من تواضع لله رفعه الله کی کثرت سے اوروں کو بھی تلقین فرماتے اور خود آخر وقت تک اس پر اتنے عمل پیرا رہے کہ انتہائی ضُعف اور عارضۂ قلب کے دوران بھی جب مہمان ملاقات کے لیے آتے تو ہر ایک سے ملنے کے لیے اُٹھ کر معانقہ کرنے کی کوشش فرماتے اور ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر وقت ایک خادم ان کے قریب رہتا تاکہ آپ کے اٹھنے اور مہمانوں سے ملنے میں تعاون ہو سکے۔ اگر کبھی اتفاق سے متعدد مہمانوں کی آمد کے موقع پر ان کے اٹھنے میں سہارا دینے والا موجود نہ ہوتا تو مہمانوں کے لیے نہ اٹھنے کو شدت سے محسوس فرماتے ہوئے مہمانوں سے بار بار اپنی نقاہت اور ضعف کے لیے معذرت فرماتے۔ رات کے لیے ٹھہرنے والے مہمانوں سے اُس وقت تک رخصت نہ ہوتے جب تک اُن کی تمام ضروریات مکمل ہونے کی بذاتِ خود تسلی نہ فرما لیتے۔

حیوانات پر شفقت

صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوانات تک کو بھی تکلیف میں دیکھنا ان کے لیے گوارا نہ تھا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل تک اپنے گھر میں دودھ وغیرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے گائے اور پھر بھینس وغیرہ کے پالنے کا اہتمام فرماتے جن کے لیے باقاعدہ ایک ملازم مقرر فرماتے جو ہمہ وقت اِن جانوروں کی خدمت پر مامور رہتا۔ اس کے باوجود صبح درس کیلئے گھر نکلتے ہوئے اور پھر عصر کی نماز سے فراغت کے بعد مسجد سے واپس آتے ہوئے جانوروں کے پاس جا کر کافی دیر تک خود دیکھتے کہ صحیح طریقہ سے جانوروں کے چارہ و پانی وغیرہ کا بندوبست ہو چکا ہے یا نہیں؟ اور جب تک ان کو خود تسلی نہ ہو جاتی کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں ہوتے تھے۔

ہمسایوں سے سلوک

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ و ابن عمرؓ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "جبریل امینؑ نے مجھے ہمسایوں کی رعایت اور نگہداشت کی اس قدر تلقین کی کہ مجھے گمان ہوا کہ پڑوسیوں کو ایک دوسرے کا وارث قرار دیں گے" پر حضرت شیخ الحدیثؒ اس قدر عمل پیرا رہے کہ اگر گھر سے متصل مسجد میں کوئی ہمسایہ نمازی دو چار وقت نماز سے غیر حاضر رہتا تو صحت کے دنوں میں خود اور بیماری کی حالت میں کسی قاصد کے ذریعہ فوراً اس کی احوال پرسی کرتے۔ اور اگر محلہ یا ہمسایوں میں موت وغیرہ کا حادثہ ہو جاتا تو بذاتِ خود تین دن تک اُن کے ساتھ شریکِ تعزیت رہتے اور ان کے گھر سے جنازہ نکلنے کے بعد میت کے اہلِ خانہ کے لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کا کھانا اُن کے گھر بھیج دیتے۔ جب بھی کبھی کوئی اہم سیاسی یا غیر سیاسی مسئلہ پیش آتا تو پہلے اہلِ محلہ اور ہمسایوں سے مشورہ کرتے اس کے بعد بات آگے بڑھاتے۔

عامۃ الناس سے تعلق اور انسانی ہمدردی کا بلند معیار

ان کا یہ تعلق صرف اہلِ محلہ اور ہمسایوں تک محدود نہ تھا بلکہ پورے شہر اور اردگرد کے اہلِ دیہات اور متعلقین کو بھی اپنی خصوصی توجہات سے نوازتے تھے۔ صحت کے ایام میں اکوڑہ خٹک جیسے بڑے قصبہ اور قرب و جوار کے دیہات میں جہاں کہیں سے بھی میت و جنازہ کی اطلاع آتی شرکت کے لیے پہنچ جاتے حتیٰ کہ جب تک مکمل صاحبِ فراش نہ ہوئے یہ معمول جاری رکھا۔ اور یہ ان کے اس تعلق اور روحانی عظمت کا نتیجہ تھا کہ عیدین کے موقع پر علاقہ کے ہزاروں لوگ عید کی مبارکبادی کی خاطر دور دراز سے ان سے ملنے کے لیے آتے۔ ہر ایک سے ملنے کے لیے اپنے مقام سے ضرور اٹھتے اور رخصتی سے پہلے ہر ایک کو اپنی طویل دعوات سے نوازتے۔ ہر ایک ملاقاتی واپسی پر یہ تصور لے کر جاتا کہ آپ کی خصوصی محبت اور تعلق کا محور میں ہی ہوں، اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے۔

حالتِ سفر میں رفقائے سفر کے آرام و راحت کو ترجیح دیتے

سفر کے دوران اپنے آرام و راحت کا خیال رکھنے کے بجائے ہمیشہ اپنے رفقاءِ سفر کی سہولت و آرام پر خصوصی توجہ دیتے۔ احقر چونکہ اکثر و بیشتر سفر کے دوران آپ کی خدمت و رفاقت کی ذمہ داری سنبھالتا رہا تو قدم قدم پر مشاہدہ ہوا کہ اگر راستے میں کہیں رکنا ہوا تو رکتے ہی سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کے قیام و طعام کا بندوبست فرماتے بلکہ بار بار اپنی جائے قیام سے رفقاء کے پاس تشریف لے جا کر ان کے آرام و سہولت کے بارہ میں پوچھتے۔ اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سفر کے دوران اگر مہمانوں کی آمد ہوتی اور جگہ کی قلت ہوتی تو اپنا بستره و چارپائی اُن کو پیش کر کے خود فرش پر سونے کا ارادہ فرما لیتے۔

ذوقِ مطالعہ اور کتب بینی کا اشتیاق

گھر میں زیادہ تر وقت مطالعہ یا عبادت و ذکر و اذکار میں گذرتا۔ اپنی چارپائی کے اردگرد بے شمار بکھرے ہوئے ذخیرۂ کتب میں سے جو کتب زیرِ مطالعہ یا زیرِ درس رہتیں، کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد ان کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ حتیٰ کہ جب آخری عمر میں بینائی میں کافی کمی آگئی اور کتب کے حواشی وغیرہ کے مطالعہ میں دقت محسوس ہونے لگی تو اس کی وجہ سے ان کو جو پریشانی اور قلق رہتا اس کا بار بار اپنے معالجین سے اظہار فرماتے رہے۔ جب ڈاکٹر دل کی تکلیف پر پریشانی کا اظہار کر کے اس کے لیے دوائیں تجویز کرتے تو اُن کو جواباً فرماتے کہ مجھے دل کی تکلیف کی تکلیف کی فکر نہیں بلکہ آنکھوں کے ضعف کے لیے ایسی دوا بتا دیں جس کے ذریعہ سے مطالعہ اور تدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔

ملاقاتیوں اور اضیاف کی خاطر داری

عبادت و ذکر شروع کرتے تو کئی کئی گھنٹے اسی میں منہمک رہتے۔ عام معمول یہ تھا کہ ہر نماز کے لیے گھر سے ملحقہ مسجد میں تشریف لے جا کر جب تک صحت اجازت دیتی تھی خود پڑھاتے ورنہ دوسرے کی اقتداء میں نماز پڑھ لیتے۔ جب عمر کے آخری حصہ میں مسجد تک جانا بھی مشکل ہو گیا تھا پھر بھی نماز با جماعت ترک نہ کی۔ گھر سے سہارا دے کر دروازہ تک اور پھر دروازہ سے تلامذہ اور خدام کے سہارے سے مسجد میں پہنچ جاتے۔ نماز کے بعد ابتداء ہی سے یہ معمول رہا کہ کچھ دیر مسجد میں رک کر واردین و ملاقاتیوں کے مسائل کے جوابات دے کر ان کی تشفی فرماتے، اور دعوات کی خاطر آنے والوں کو اپنی دعواتِ مستجابہ سے نوازتے۔

اس مختصر سی محفل کے دوران اکثر و بیشتر علماء و معتقدین کے پوچھنے پر علم و فضل اور پند و نصائح کے وہ نکات بیان فرماتے جن کی ایک جھلک دارالعلوم کے جید و فاضل مدرس برادرِ محترم مولانا عبدالقیوم حقانی کی تالیف "صحبتے با اہلِ حق" میں نمایاں ہے۔ "حقائق السنن" کی جلد اول اور دوسری جلد کے آدھے سے زائد حصہ کے مسودات بھی عصر کے وقت اور گاہے گاہے حسبِ ضرورت بعد المغرب بھی حقانی صاحب موصوف سنایا کرتے تھے، عجیب سماں بندھتا۔

آہِ سحرگاہی، الحاح وگریہ اور تہجد کا اہتمام

عصر کے بعد مسجد سے فارغ ہونے پر گھر میں تلاوتِ قرآن، دلائل الخیرات اور دیگر اذکار کے ورد میں مصروف ہو جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد نوافل کی ادائیگی کا طویل سلسلہ عشاء تک اور پھر عشاء کے بعد بھی جاری رہتا۔ اس کے بعد مطالعہ فرماتے، پھر مختصر آرام کے بعد اٹھ کر تقریباً اڑھائی بجے پھر صلوٰۃِ تہجد شروع کر دیتے، تہجد کے دوران قدرے وقفہ میں ذکرِ الٰہی ایک عجیب کیفیت و آواز سے شروع فرماتے، اسی دوران گریہ اور بکاء کی جو حالت ہوتی اور آنسوؤں کی اس طرح جھڑی

بند میں ایسا معلوم ہوتا کہ سارے جہاں کا درد ان ہی کے جگر میں ہے۔

تراویح اور ختم قرآن کا اہتمام

رمضان المبارک میں تراویح کے دوران ختم قرآن میں شرکت کا سلسلہ آخر تک جاری رکھا۔ چونکہ یہ سعادت احقر کو حاصل رہی کہ آپ کی حیات میں تقریباً بائیس سال گھر سے قریب مسجد میں تراویح میں قرآن حضرتؒ کو سناتا رہا، تو جب تک صحت نے اجازت دی تمام تراویح میں کھڑے ہو کر شرکت فرماتے رہے، جب بیماری و ضعف میں اضافہ ہوا تب بھی شرکت کا سلسلہ منقطع نہ فرمایا اور بیٹھ کر آخر تراویح تک شریک رہتے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ سے تعلق خاطر اور ان کی دعاؤں کے حصول اور اس مبارک اور پرانوار محفل میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اہل محلہ کے علاوہ دور دراز علاقوں سے بھی کافی لوگ ہر سال اہتمام سے آجایا کرتے تھے۔ حضرت الشیخؒ جب نماز سے فارغ ہو جاتے تو اہل محلہ، جملہ حاضرین و متعلقین، دار العلوم کے فضلاء، افغان مجاہدین اور تمام عالم اسلام کے لیے بڑے الحاح اور عجز و انکسار سے دعا فرماتے۔ حاضرین کے لیے دعا ہوتی تو سب حاضرین کو یقین ہو جاتا کہ دعا ان کے حق میں قبول ہو چکی ہے، اور یہ معمول زندگی کے آخری رمضان تک قائم رہا۔

تدریس حضرت الشیخؒ کا محبوب ترین مشغلہ تھا

علوم دینیہ کی تدریس ان کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ ان کے ہمعصروں سے سنا ہے کہ دار العلوم دیوبند میں تدریس کے دوران مدرسہ کی طرف سے حوالہ کی گئی کتب کے علاوہ بھی بیسیوں کتب طلباء کو خارجی پڑھاتے رہے۔ اور یہی سلسلہ دیوبند سے آنے کے بعد جب دار العلوم حقانیہ وجود میں آیا، اس سے بھی بڑھ کر جاری رہا۔ حتیٰ کہ دار العلوم کے ابتدائی دور میں تفسیر و حدیث و دیگر علوم و فنون کی چالیس پینتالیس کے قریب ضخیم کتب روزانہ زیر تدریس رہتیں۔ کسی صورت میں تدریسی سلسلہ میں انقطاع کو برداشت نہ کرتے۔ اگر کبھی درس حدیث کے دوران جنازہ کی اطلاع آجاتی تو درس کی تمام جماعت کو کتب سمیت اپنے ساتھ لے جاتے اور جنازہ پڑھانے کے بعد جنازہ گاہ ہی میں بیٹھ کر تدفین تک اپنی تدریسی ذمہ داری کو ادا کرتے۔ بیماریوں کے حملہ سے پیشتر دار العلوم حقانیہ میں صحاح ستہ کا بیشتر حصہ خود پڑھاتے تھے۔ اور سال کے آخری مہینوں میں تو فجر کی نماز کے بعد پڑھانے کے بیٹھتے تو یہ سلسلہ رات دس گیارہ بجے تک جاری رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ علوم نبویہ کی تدریس ہی ان کی روح و جان کی اصل غذا اور مدار حیات ہے۔

تدریس کا سلسلہ قریباً نصف صدی تک بڑے انہماک سے جاری رکھا۔ درس حدیث کا طرز و نہج اپنے استاذ و مرشد شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے طریقہ سے مشابہ تھا۔ درس میں شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کا اسلوب اور جوش و خروش رہتا۔ سال کے ابتداء اور آخر میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ جس مسئلہ پر تفصیل سے وضاحت کی ضرورت پڑتی اگر طبیعت خراب بھی ہوتی تب بھی تفصیل و وضاحت میں اختصار سے کام نہ لیتے۔ اختلافی مسئلہ بیان کرتے وقت ہر امام و مجتہد کا نام بے پناہ عقیدت کی وجہ سے القابات و احترام سے لیتے، اور کسی قول کو ترجیح دیتے وقت اس سے مختلف رائے رکھنے والے کسی بھی صاحب مسلک کا تذکرہ بے ادبی یا عامیانہ انداز سے بیان نہیں فرماتے تھے بلکہ فریقین کے ائمہ اور اصحاب مسلک کے نام میں برابر کا احترام جاری رہتا۔

تدریس کے ساتھ یہ والہانہ عقیدت و تعلق صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھا، اپنے لیے جو کچھ پسند فرمایا دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔ جب بھی دار العلوم کا فاضل یا عالم اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارہ میں مشورہ لینے کے لیے آیا، ذیادی مشاغل کا مشورہ دینے کی بجائے صرف اور صرف تدریس شروع کرنے کی نصیحت فرماتے

ایسا معلوم ہوتا کہ علوم نبویہ کی تدریس ہی ان کی روح و جان کی اصل غذا اور مدار حیات ہے

اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ یہ پرواہ نہ کی جائے کہ چھوٹی کتاب پڑھانے کو ملی ہے یا بڑی! بلکہ اشاعت دین کے فضائل بیان کرنے کے بعد اپنے اساتذہ و اکابر علماء دیوبند کی تدریسی مصروفیات و کارناموں کے واقعات سناتے۔ علوم نبویہ کے ساتھ آپؒ کے اس شغف اور تعلق کا نتیجہ ہے کہ آج مسلم دنیا ہو یا غیر مسلم ہر جگہ ان کے بالواسطہ یا بلاواسطہ روحانی فرزند دینی علوم کے پھیلانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کسی نہ کسی میں سرگرم عمل ہیں، اور اخروی نتائج پر قرآن و حدیث کے ذخائر شاہد ہیں۔

تربیت اولاد

گھر کے افراد کے سلسلہ میں آپؒ جس قدر شفیق و مہربان واقع ہوئے اسی طرح اہل خانہ کے لیے دینی امور پر پابندی کے لیے کسی نرمی کے روادار نہ تھے۔ بچپن ہی سے تمام بچوں اور بچیوں کے لیے دینی تعلیم و تربیت کا بندوبست فرمایا۔ بڑے بھائی حضرت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کو تو بالکل بچپن ہی سے دینی علوم پڑھنے کے لیے جید اساتذہ کے حوالے کر دیا اور ہم باقی تین بھائی جو کہ دار العلوم کے زیر انتظام تعلیم القرآن پرائمری سکول میں پڑھ رہے تھے، کے لیے لازم کر دیا کہ سکول سے آنے کے بعد دار العلوم کے اساتذہ سے علوم دینیہ کی ابتدائی کتب پڑھنے کا اہتمام کریں۔ اور جب سکول کی معتد بہ تعلیم مکمل کر لی تو درس نظامی میں باقاعدہ طور پر داخل فرمایا اور پھر دینی تعلیم کی مکمل نگرانی فرمائی۔

اور الحمد للہ یہ انہی کی دینی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی اولاد ان ہی کے لگائے ہوئے دینی گلستان کی جلا و آبیاری کے لیے اپنی بساط کے مطابق اپنے آپ کو وقف کر چکی ہے۔

طالبان علوم نبوت کی خدمت

آپ کی اسی اصول تربیت کا اثر

تھا کہ گھر سے قریبی مسجد جہاں سے ابتدائی دور میں دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں علم وعرفان کی شعاعیں اطرافِ عالم میں پھیلتی رہیں، مسجد اور اس سے ملحقہ کرایہ کے مکانات میں تقریباً ساڑھے تین سو طلبہ علوم نبویہ اقامت پذیر تھے، ان کے لیے دو وقت طعام آپ کی اہلیہ مرحومہ یعنی ہماری والدہ محترمہ نوراللہ مرقدھا خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ نمازِ فجر سے لیکر آٹا گوندھنے اور تنور پر خود پکاتے اور پھر دو وقت کے لیے سالن کی تیاری میں سحری سے عشاء تک وقت گذر جاتا مگر خدا کی اس بندی نے کبھی پیشانی پر شکن نہ آنے دی حالانکہ اکثر ان کی صحت بھی خراب رہتی اور جون جولائی کی جھلسا دینے والی گرمی اور دسمبر وجنوری کی سخت ترین سردی کا بھی سامنا کرنا پڑتا

ورع وتقویٰ اور مشتبہ اشیاء سے اجتناب

گھریلو زندگی، دنیوی معاملات اور ضروریات میں استعمال کی تمام اشیاء میں انتہائی احتیاط برتتے حتیٰ کہ کسی مشتبہ چیز کو ہاتھ تک لگانے کا تصور بھی نہ فرماتے۔ اور یہ احتیاط صرف گھر تک محدود نہ تھی بلکہ دارالعلوم کی کسی چیز کو ذاتی تصرف میں لانے کا کبھی سوچا تک بھی نہیں جس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ دارالعلوم کے ابتدائی دور سے ہی اس کے اعلیٰ درجہ سے لے کر نچلے درجہ تک کے تمام ملازمین کی جملہ ضروریات از قسم مکان، بجلی، پانی، سوئی گیس وغیرہ کے اخراجات دارالعلوم برداشت کر رہا ہے، مگر آپؒ نے آخر دم تک ان تمام سہولتوں سے اجتناب کیا اور دارالعلوم سے کافی دُور اپنے آبائی، محدود و مختصر گھر میں اپنے ذاتی اخراجات سے ہی گذارہ کرنے پر اکتفاء کیا۔

ماہانہ مشاہرہ اور حضرتؒ کا معمول

تدریس اور اہتمام و انتظام دارالعلوم کے عوض انتہائی معمولی مشاہرہ پر قانع رہنے، کبھی بھی تنخواہ کے اضافہ کا مطالبہ تو درکنار خواہش تک کا بھی اظہار نہ فرمایا۔ بسا اوقات دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں کے دوران علی العموم عملہ کی تنخواہوں پر غور اور اضافہ کے مطالبات پیش ہوتے تو اکثر اراکین شوریٰ حضرت الشیخؒ کی تنخواہ میں اضافہ پر بھی زور دیتے تو آپؒ دیگر عملہ کے مشاہرات میں اضافہ کی تجاویز کی تائید کے بعد اپنے مشاہرہ میں اضافہ کا پُرزور الفاظ میں انکار فرما دیتے۔ چونکہ آپ کا نظریۂ حیات ہی دین کی خدمت کرکے اس کا اجر وثواب مابعد الوفات اور آخرت میں حاصل کرنا تھا اس لیے بسا اوقات سال بھر مختصر تنخواہ لینے کے بعد سال کے آخر میں رمضان المبارک کے دوران کسی نہ کسی شکل میں مشاہرات کی صورت میں لی ہوئی رقم دارالعلوم میں بطور چندہ داخل فرما دیتے۔

دارالعلوم کے اخراجات پر گاڑی خریدنے کی پیشکش ٹھکرا دی

دارالعلوم کے مالی امور اور اخراجات میں احتیاط و ورع کی یہ حالت تھی کہ وفات سے چند سال قبل جبکہ امراض میں اضافہ کی وجہ سے اپنے گھر سے دارالعلوم پیدل آنا ناممکن ہو گیا تو اپنے لیے کرایہ پر صبح و دوپہر ٹانگہ منگوا کر دارالعلوم آنے جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مجلس شوریٰ کے کئی ارکان نے اصرار کیا کہ ملک کے اکثر و بیشتر مدارس کے منتظمین نے اپنے ادارہ جات کی ضروریات کے لیے ادارہ ہی کے اخراجات سے گاڑیوں کا بندوبست کیا ہوا ہے، تو کیوں نہ آپ کے لیے بھی دارالعلوم کے فنڈ سے گاڑی خریدی جائے، جس کے ذریعے دارالعلوم اور گھر آنے جانے میں سہولت رہے۔ مگر آپؒ کسی صورت میں دارالعلوم کے خرچ سے گاڑی خریدنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر ایک عقیدتمند نے اپنے ذاتی مصارف سے گاڑی خرید کر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کی، جس کے بعد ان کا دارالعلوم آمد و رفت کا سلسلہ گاڑی کے ذریعہ شروع ہو گیا۔

دارالعلوم میں کسی نئے مکان کی بجائے آبائی گھر کو ترجیح دی

مرضِ شوگر میں اضافہ، عارضۂ قلب اور بینائی میں کمزوری جیسے عوارض کے دوران بھی دارالعلوم سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ دُور گاؤں، ٹریفک کے ہجوم اور تنگ گلیوں میں آپؒ کی آمد و رفت آپ کے معتقدین اور دارالعلوم کے ارکان و خدام پر شاق گذرتی، جس کی وجہ سے کئی بار حضرتؒ کی خدمت میں تجویز پیش کی گئی کہ اب تو آپ کیلئے اتنی دُور سے آنا جانا ناممکن ہو گیا ہے، جس کے پیش نظر کیوں نہ دارالعلوم کے قرب وجوار میں یا دارالعلوم کے اندر ہی کسی مکان کا بندوبست کیا جاوے جس میں مستقل سکونت رہے مگر ان کا مطمع نظر چونکہ اس راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے والوں کے درجات ملحوظ رہے نیز دارالعلوم کے وسائل سے ذاتی فوائد حاصل کرنے سے اجتناب بھی ملحوظ خاطر رہا، لہٰذا آخر دم تک دارالعلوم سے دُور اپنے آبائی گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔

حزم واحتیاط کا ایک واقعہ

خوفِ خدا، تقویٰ واحتیاط کے اس چلتے پھرتے نمونۂ مجسم نے اپنی پوری زندگی کے کسی موقع و موڑ پر ان اوصاف میں نہ صرف یہ کہ کمی نہ آنے دی بلکہ قدم قدم اور لحظہ لحظہ اس پر ثابت قدم رہ کر اپنی زندگی کو اوروں کے لیے مشعلِ راہ بنا دیا۔ جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں بھی پورے طور پر نمایاں ہے کہ کافی عرصہ قبل جبکہ ان کے آبائی گھر کے بعض کمروں کی تعمیر ہو رہی تھی، لنٹر کا مرحلہ آیا تو گھر کے کمروں کی پُشت مسجد کے صحن سے متصل ہونے کی وجہ سے مستریوں کا خیال تھا کہ چھت کا تھوڑا سا حصہ بطور شیڈ مسجد کی طرف فضا میں بڑھایا جائے جس سے گھر کے اوپر والے حصہ (جہاں حضرتؒ تمام عمر مقیم رہے) کے صحن میں معمولی فراخی آجائے گی۔ حضرتؒ کو جب معلوم ہوا کہ مسجد کے صحن کے فضائی حصہ کو ذاتی تصرف میں لانے کا احتمال ہے تو فوراً کام کرنے والوں کو اس ارادہ اور اس پر عمل کرنے سے روک دیا۔

- - - - - - - - -

لفٹ کی پیش کش اس لیے ٹھکرا دی کہ اس کا دروازہ مسجد کے صحن میں کھلتا تھا

عمر کے آخری سالوں میں جب کہ بغیر دو خدام کے سہارا کے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا اس کے باوجود گھر کے بالائی حصہ (جس کی سیڑھیاں پُرپیچ اور تھکا دینے والی تھیں) سے اُتر کر ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں میں شرکت کے لیے گھر سے ملحق مسجد میں حاضری فرماتے۔ اس دوران آپؒ کے ایک محبِ خاص لاہور کے الحاج محمد یٰسین (جو کہ ابتدا میں شیخ التفسیر، قدوۃ السالکین حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خادمِ خاص رہے اور اُن کی رحلت کے بعد جانشینِ شیخ التفسیرؒ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تعلق کی بناء پر ان کے حکم اور مشورے سے حضرتؒ کے حلقۂ ارادت میں شرکت کے لیے اکوڑہ خٹک حاضری دینے لگے) ہر وقت اس فکر میں رہتے کہ حضرتؒ کے کمرۂ سکونت و نقل و حرکت میں جس قدر سہولتیں ہو سکیں مَیں ہی یہ خدمت ادا کرتا رہوں۔ اللہ تعالیٰ اس بندۂ خدا کو جزائے خیر سے نوازے کہ واقعی انہوں نے اپنے شیخؒ کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہ لیا۔ حاجی صاحب موصوف نے حضرتؒ کے بار بار بمشکل اپنے کمرہ سے مسجد و دارالعلوم آنے جانے کو محسوس کرتے ہوئے ان کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ گھر کے بالائی حصہ سے ملحق پڑوسی کے مکان سے دو تین گز کا ٹکڑا خواہ جس قدر دام سے وہ بیچے خرید لی جائے اور لفٹ کا بندوبست مَیں اپنے خرچ سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ سیڑھیوں سے اُترنے کی کلفت سے حضرتؒ بچ سکیں۔ وہ جب بھی لاہور سے آتے حضرتؒ اور مجھ سے اس تجویز پر عمل شروع کرنے کی اجازت طلب فرماتے رہے، مگر حضرتؒ اُن کو صرف اس وجہ سے ٹالتے رہے کہ چونکہ لفٹ کا دروازہ مسجد کے صحن میں کھلے گا جس کی وجہ سے مسجد کے ایک حصّہ کو اپنے ذاتی تصرف میں لانے کا ارتکاب ہو جائے گا۔ جس سے وہ بچتے رہے اور اُن کی رحلت تک اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ اور ہر بار اس تجویز پر احقر کو فرماتے کہ حاجی صاحب موصوف کو مَیں مطمئن کر دوں تاکہ اُن کی حوصلہ شکنی بھی نہ ہو اور خلافِ تقویٰ کام بھی سرزد نہ ہونے پائے۔

امامت و خطابت کی نیابت کا اہتمام

گھر سے ملحق انکے آبائی محلے کی مسجد جہاں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فوراً بعد دارالعلوم حقانیہ (جسے اکابرینِ دیوبند نے دیوبندِ ثانی اور پاکستان کا دیوبند کے لقب سے نوازا) کی بنیاد رکھی، سے بے پناہ عقیدت و تعلق رہا ہے۔ جب تک بھی ممکن رہا لزوم سے اسی مسجد میں پہنچکر نماز پڑھاتے اور ہمیشہ اس مسجد کے لیے خادم و نگرانی جیسے امور کے لیے فکرمند رہتے۔ اگر کبھی سفر پہ جانا ہوتا تو سب سے پہلے مسجد کے لیے جمعہ و دیگر نمازوں میں امام و خطیب کا تعین فرما کر مطمئن ہوتے، اور اگر کبھی اتفاق سے پہلے سے بندوبست کیے بغیر اسمبلی کے اجلاس کے دوران یا کسی اور سفر کے سلسلہ میں باہر رُکنا پڑ جاتا تو اُس وقت تک بے چین رہتے جب تک ٹیلیفون یا کسی دوسرے ذریعہ سے اکوڑہ خٹک اطلاع دے کر مسجد مذکور میں خطابت کا انتظام نہ فرما لیتے۔ عام معمول یہ تھا کہ جمعہ کے دن حضرتؒ کے عقیدتمند اور ان سے ملاقات کے شائقین کثیر تعداد میں دُور دراز علاقوں سے نمازِ جمعہ کے لیے اسی مسجد میں تشریف لے آتے، اور پھر نماز کے بعد ملاقاتوں، دعوات اور مسائل کے سلسلے میں ان سے سوالات و جوابات کا سلسلہ نمازِ عصر تک جاری رہتا۔ رمضان المبارک میں باقاعدگی سے اعتکاف کے لیے کسی دیندار شخص کا تعیّن فرما کر اعتکاف کے دوران معتکف کی جملہ ضروریات کا بذاتِ خود انتظام فرماتے۔

مسجد کی تعمیرِ ثانی کا افتتاح

رحلت سے دو تین سال قبل مسجد کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی، آپؒ کی دلی خواہش تھی کہ اس تاریخی مسجد کی تعمیر اس کے شایانِ شان ہو سکے، مسئلہ مالی وسائل و ذرائع کا تھا۔ اگر وہ اپنے کسی عقیدتمند کو اشارہ فرما دیتے تو اُن کی زندگی ہی میں عظیم الشان مسجد تعمیر ہو جاتی، مگر انہوں نے اپنے معمول کے مطابق اپنی زندگی میں کسی آنے والے مہمان یا اہلِ خیر کو خود نہ دارالعلوم کے تعاون کا فرمایا اور نہ مسجد کے لیے۔ اور اگر کبھی ان کی موجودگی میں دارالعلوم کے کسی رُکن یا خیرخواہ نے کسی آنے والے کی توجہ دارالعلوم سے مالی تعاون کے لیے مبذول کرائی بھی تو انہوں نے غایت حیا اور اصولِ مہمانداری کے خلاف محسوس فرما کر اسے بُرا جانا۔ ان کے احتیاط و تقویٰ کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ ان کے ایک عقیدتمند الحاج محمد ایوب مامون صاحب نے کراچی سے مسجد کی تعمیر کے لیے ابتداء میں بیس ہزار روپے ارسال کیے، یہ رقم امانتاً محفوظ کر دی۔ کیونکہ اس مسجد کی تعمیر اتنی رقم سے شروع کرنی ناممکن تھی، صرف اس کا ملبہ نکالنے پر اس سے زیادہ رقم کے اخراجات کا تخمینہ تھا۔ یہ رقم تقریباً ڈیڑھ سال خرچ نہ ہو سکی جس کی وجہ سے بیحد پریشان رہتے کہ حاجی صاحب کیا سوچیں گے کہ میری رقم کیوں خرچ نہ ہوئی اور بار بار احقر کو تاکید فرماتے کہ حاجی محمد ایوب مامون کو لکھ دوں کہ آپ کی مُرسلہ رقم محفوظ ہے کام شروع ہونے پر خرچ کر دی جائے گی۔

آخری بار گھر میں دل کا دورہ پڑنے اور ہسپتال جانے سے ایک دن قبل

---

[1] یہ مسجد تاریخی اعتبار سے دارالعلوم کے ہزاروں قدیم فضلاء، مبلغین، مدرسین کی اوّلین مادرِ علمی ہے۔ اسی طرح افغانستان کے معرکۃ الآراء میدانِ کارزار کے صفِ اوّل کے قائدین مولانا محمد یونس خالص، مولانا فتح اللہ حقانی شہید، مولانا احمد گل حقانی شہید، مولانا نظام الدین حقانی، مولانا جلال الدین حقانی کی تعلیم گاہ اور تربیت کی چھاؤنی ہے۔ "دعواتِ حق" دونوں جلدیں کے زیادہ تر خطباتِ جمعہ اسی مسجد میں ارشاد فرمائے گئے۔ یہ مسجد صرف مسجد ہی نہیں بلکہ مرکزِ علم ہونے کی وجہ سے پوری ملت کے لیے تاریخی اثاثہ ہے۔

(بقیہ صـ ۱۳۸ پر)